دستک

دستک

نریش کمار شاد

مکتبہ نقوش جالندھر

طبع اول — اگست ۱۹۵۸ء

قیمت دو روپے

لالہ جگت نارائن چوپڑہ کے اہتمام سے ہند سماچار پرنٹنگ پریس جالندھر میں طبع ہوئی۔

(پبلشر نریش کمار شاد)

ترتیب

ابتدائیہ

نریش کمار شاد ایک ہونہار شاعر ہیں۔ ان کا مطالعۂ حیات بھی کافی گہرا ہے اور وہ اپنے مطالعہ کو شاعرانہ لباس پہنانے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

اُن کا طرزِ بیاں سیدھا سادا رواں واضح اور دل نشیں ہے۔ اور وہ جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں۔ بڑی خوبی کے ساتھ اسے دُوسروں کو بھی محسوس کرا دیتے ہیں۔ اور یہی چیز شاعری کی جان ہے۔ جس میں قوّتِ ابلاغ نہ ہو۔ وُہ شاعر کیا ہو سکتا ہے۔

"جوانی دوانی" مشہور ہے۔ اس لئے جوانی صرف رنگ و بُو۔ بادۂ و ساغر رامش و رنگ۔ چشم و رُخسار اور عشوہ و ناز ہی کو دیکھ سکتی ہے اور ان رنگین پردوں کو اُٹھا نہیں سکتی —— لیکن نریش کمار شاد کی جوانی ان حریر و پرنیاں کے پردوں کو چاک کر کے بدحالی، بدہیئتی، افسردگی، خستگی، تشنگی، اور گرسنگی غرضیکہ تمام شدائدِ حیات کا بھی مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ اور یہ وہ جوہر ہے۔ جو بہت ہی کم افراد میں پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شاد بہت زیادہ قابلِ قدر اور شایانِ تحسین ہیں۔

ہرچند ان شدائدِ حیات میں اُلجھنے سے جوانی کی توہین ہوتی ہے۔ لیکن جس بازار میں حیاتِ انسانی کو برہنہ کر کے ہر آن اس کی توہین و تذلیل ہو رہی ہو وہاں جوانی کی توہین کونسی عجیب بات ہے۔

قابلِ مُبارک باد ہے۔ وُہ نوجوان جو احترامِ انسانیت کی خاطر اپنے موسمِ بہار کی توہین کی بھی کوئی پروا نہ کرتا ہو۔ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

میری دلی آرزو ہے کہ نرلیش کمار شاد کو قبولِ خاطر اور حُسنِ سخن حاصل ہو ان کا نفسِ گرم ٹھٹھری ہوئی زندگی کے احساسات کے دائرے میں ہم ہمہ، ہل چل، حرکت اور حرارت پیدا کر کے اس صُبحِ سعادت کے طلُوع ہونے کی رفتار کو تیز تر کر دے۔ جو افق کے ابرِ غلیظ سے دست و گریباں اور بہ مصروفِ پیکار ہے

جوشؔ ملیح آبادی

پیش لفظ

جب تصوّر کے سنہری قصر میں آباد تھی
شاعری میری شباب و حسن کی روداد تھی
جو حسیں چہرے ابھی تک تھے نقابِ راز میں
مُسکراتے تھے مری جادو بھری آواز میں
جن گھنی زلفوں سے نامانوس تھی میری نظر
منتشر تھیں میرے شیریں زمزموں کے دوش پر
کتنے ان دیکھے پری رُخ - ماہ پیکر - سیم تن
میرے احساسات کی آغوش میں تھے خندہ زن
ان گنت موہوم سینوں کی رسیلی دھڑکنیں
سانس لیتی تھیں میرے ہنستے ہوئے نغمات میں
سینکڑوں انجان آنکھیں با ہزاراں آب و تاب

گھومتی تھیں میرے مینائے تخیّل میں شراب
الغرض اک دور تک اس نغمہ زارِ خواب میں
حسن و مستی کی خیالی وادیٔ شاداب میں
مل سکا جب تک نہ انوارِ صداقت کا سراغ
اک شرابی کی طرح سویا رہا میرا دماغ

اور پھر جب ہو گیا قصرِ تصوّر چور چور
کر دیا بیدار دستِ وقت نے میرا شعور
دیکھتا کیا ہوں کہ اس دنیائے آب و رنگ میں
محنت و سرمایہ کی ہر آن بڑھتی جنگ میں
جو لب و رخسار میری شاعری کا نور ہیں
جا بجا نیلام ہونے کے لئے مجبور ہیں
جن گھنی زلفوں کی خوشبو ہے مرے ادراک میں

سطوتوں کے ہاتھ ان کو روندتے ہیں خاک میں
جو شگفتہ ہونٹ ہیں میرے تخیّل کا سہاگ
ڈس رہے ہیں ان کے رنگ و حسن کو چاندی کے ناگ
میرا فن جن دل نشیں چہروں کا ہے آئینہ دار
پائے زر میں کھا رہا ہے ٹھوکریں اُن کا وقار
جن حسیناؤں کے خاکے ہیں مرے اشعار میں
بک رہے ہیں جسم ان کے بھوک کے بازار میں
یہ مناظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹ گیا
ذہن سے گلپوش رومانوں کا بادل چھٹ گیا

کر دیا زخمی حقائق نے مرا ذوقِ جمال
جل گئے نارِ صداقت میں مرے رنگیں خیال
زہر سے لبریز ہیں اب میرے نغموں کے سبو

کھولتا ہے میرے اک اک شعر میں میرا لہو

اب میرا باغی تفکّر کھیلتا ہے آگ سے

آنچ آتی ہے جہنم کی مرے ہر راگ سے

اب مرے ہر شعر کے سینے میں ہے گرمِ خرام

نورِ فردا - شورِ رستاخیز - سوزِ انتقام

اب فضا کا دل دہلتا ہے مری آواز سے

بجلیاں جوشِ نمو لیتی ہیں میرے ساز سے

اب علیٰ اعلان ہوں میں اس تمدّن کا حریف

جس میں پل سکتا نہیں کوئی بھی احساسِ لطیف

لاکھ ہوں پابندیاں عائد مرے افکار پر

لاکھ ہوں اس بے بصر قانون کے پہرے مگر

یہ نظامِ زندگی جب تک بدل جاتا نہیں

نرم ہو سکتی نہیں میری نوائے آتشیں

خاموشی

اک مری ذات اور خاموشی

کچھ خیالات اور خاموشی

ہائے کتنا اداس منظر ہے

چاندنی رات اور خاموشی

تنہائی

جانے کتنی حسین راتوں کی

یاد لہرا رہی ہے آنکھوں میں

چاندنی رات اور تنہائی

نیند شرما رہی ہے آنکھوں میں

ماضی

چاندنی میں دُھلی ہوئی راتیں
ایک گلفام سے مُلاقاتیں
میرے ماضی! مرے حسیں ماضی
ہائے کیا ہوگئیں تری باتیں

آرزو

حُسنِ فطرت میں جذب ہو جاؤں
سیمگوں روشنی میں کھو جاؤں
کاش میں آج رات بھر کے لئے
چاندنی سے لپٹ کے سو جاؤں

ایک منظر

چاندنی رات گیسوؤں کے سحاب

کروٹیں لے رہی ہے شرحِ شباب

ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے

میرا احساس پی رہا ہے شراب

فطرت

ہر حقیقت کا راز کھولا ہے

ہر مسرّت کا دِل ٹٹولا ہے

زِندگی کے حسین چشموں میں

میری فِطرت نے زہر گھولا ہے

اعجاز

ہر کلی مستِ خواب ہو جاتی

پتّی پتّی گلاب ہو جاتی

تُو نے ڈالیں نہ مے فشاں نظریں

ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

اندیشہ

اس قدر راز جو نہ ہو جاؤں

بے خودِ آرزو نہ ہو جاؤں

یہ تجسّس۔ یہ جُستجو۔ یہ تلاش

میں کہیں ہیں سے تو نہ ہو جاؤں

مرحوم دوست

ایک مرحوم دوست کا چہرہ
پھر رہا ہے مری نگاہوں میں
جیسے اک بدنصیب شہزادی
جنگلوں کی اُداس راہوں میں

اِنتباہ

جن کے اطوار میں خلوص نہیں
میرے ان دوستوں کا نام نہ لے
میرے ہمراز! میری فطرت سے
سادہ لوحی کا انتقام نہ لے

یاد

پھر تری یاد دِل کی ظلمت میں

اس طرح آئی رنگِ نُور لیئے

جیسے اک سیم پوش دوشیزہ

مقبرے میں جلا رہی ہو دِیے

شاعرِ تنہا

شہر سے دُور ایک جھیل کے پاس

آج بیٹھا ہُوں مَیں اُداس اُداس

خامشی۔ یاس۔ اور تنہائی

ڈس رہا ہے مجھے مرا احساس

انقلاب

مُفلسوں کے سیاہ خانوں میں
آنسوؤں کے چراغ جلتے ہیں
ان چراغوں کی جھلملاہٹ میں
سینکڑوں انقلاب پلتے ہیں

پیش گوئی

زندگی کی طویل راہوں میں
مُطلقاً پیچ و خم نہیں ہوں گے
ایک ایسا بھی وقت آئے گا
جب یہ دیر و حرم نہیں ہوں گے

احساس

کبھی کبھی مرے احساس کے حجالوں میں
کسی کی یاد دُلہن بن کے مُسکراتی ہے
نشاط و نُور میں بھیگی ہُوئی فضاؤں سے
کسی کے گرم تنفس کی آنچ آتی ہے

دماغ و رُوح میں جلتے ہیں زمزموں کے دئیے
تصوّرات میں کھلتی ہیں مرمریں کلیاں

بُجھی بُجھی ہُوئی آنکھوں پھیل جاتی ہیں

وُہ جھینپتی ہُوئی راہیں وُہ شمع گیں گلیاں

جہاں کسی نے بڑی ملتفت نگاہوں سے

دھنک کے رنگ بکھیرے تھے میرے سینے میں

طرب نواز بہاروں کا رس اُنڈیلا تھا

خزاں نصیب خیالوں کے آبگینے میں

مگر سماج کے سنگین و سرد ہاتھوں نے

ہمکتی اُڑتی اُمنگوں کے پر کتر ڈالے

بھڑک رہے تھے جو شعلے دلِ محبت میں

ہوائے جورِ زمانہ نے راکھ کر ڈالے

اُجڑ چکی ہے وہ سپنوں بھری حسیں دُنیا
سُلگتے ذہن پہ ماضی کا ہے اثر پھر بھی
نہ اَب وہ دِل ہے نہ اب دِل کے ہیں وہ ہنگامے
حیات ساکن و خاموش ہے مگر پھر بھی

کبھی کبھی مرے احساس کے حجابوں میں
کسی کی یاد دُلہن بن کے مُسکراتی ہے
نشاط و نور میں بھیگی ہوئی فضاؤں سے
کسی کے گرم تنفس کی آنچ آتی ہے

غزل

ذرّے کو بھی ہم پایۂ خورشید جو کر دے
اے تنگ نظر کون تجھے ایسی نظر دے

پھولوں کے تو قابل نہیں شاید مرا دامن
اے صاحبِ گلشن اسے کانٹوں سے ہی بھر دے

ڈرتا ہوں کہیں آپ کی بے لوث نوازش
خودداریٔ احساس کو مجروح نہ کر دے

دیکھوں میں تجھے کیا کہ ابھی راہِ نظر ہیں
حائل ہیں ترے حسن کی تنویر کے پردے

منزل سے غرض اس کو نہ جادے سے تعلق
فطرت جسے پائندگیٔ ذوقِ سفر دے

وہ اپنی جفاؤں پہ ہیں اب سر بہ گریباں
اے کاش کوئی شادِ پریشاں کو خبر دے

بھیڑیا

مری چہرہ دستی نے اک ہی جھپٹ سے
حیا کے حجابات کو نوچ ڈالا
دل آویز چہروں کی تابانیوں کو
بھیانک اندھیرے کے سانچے میں ڈھالا

کئی تیرہ بختوں کے ظلمت کدوں سے
درخشاں ستارے چرائے ہیں میں نے

اور ان فاقہ کش غیرتوں کے بدن پر
گناہوں کے کوڑے لگائے ہیں میں نے

کئی بار میرے نڈر ولولوں نے
جواں عصمتوں کے تکبّر کو توڑا
مری تشنگی نے ہزاروں لبوں سے
جوانی کا مہکا ہُوا رس نچوڑا

کئی جسم میرے شکنجے میں آکر
جوانی کی پاکیزگی کھو چکے ہیں
مری شوخ نظروں سے مغلوب ہو کر
نگاہوں کی دوشیزگی کھو چکے ہیں

ہوس کاریوں کے سم آلود نشتر
تقدس کے دل میں چبھوتا رہا ہوں
کنواری حیاؤں میں تحلیل ہو کر
گناہوں کے سائے میں سوتا رہا ہوں

ازل سے مری روح میں تشنگی ہے
میں اس تشنگی کو بجھاتا رہوں گا
امنگوں کے بپھرے ہوئے بھیڑیوں کو
لہو عصمتوں کا پلاتا رہوں گا

فریبِ نظر

اِک نظر کا فریب ہے ورنہ

بیسواؤں کے نوجواں پیکر

جان رکھتے ہُوئے بھی مُردہ ہیں

ان کے ہنستے ہُوئے حسیں چہرے

سخت مایوس ہیں فسردہ ہیں

ان کے نرم اور عنبریں گیسو
غم کی تاریکیوں کے سائے ہیں
کیف آلود احمریں عارض
ان کے اپنے نہیں پرائے ہیں

ان کی شوخ و شریر آنکھوں میں
آنسوؤں کی ضیا چمکتی ہے
نرم ہونٹوں کی مسکراہٹ میں
غمزدہ زندگی سسکتی ہے

ان کے ابھرے ہوئے جواں سینے
زخم خوردہ ہیں غم بداماں ہیں

ان کے نکہت فروز جسموں پر
جا بجا داغہائے حرماں ہیں

کھوکھلا رنگ رُوپ بکتا ہے
عصمت و حسن کی دُکانوں میں
عورتیں کیا حسین لاشیں ہیں
بیسواؤں کے بالاخانوں میں

حقیقت

مری نگاہ کے بھٹکے ہوئے اندھیرے ہیں

یہ کون آیا اُجالے کی تلخیاں لے کر

تخیّلات میں لپٹے ہوئے دھندلکوں سے

شفق سی پھوٹ پڑی غم کی داستاں لے کر

تو کون ہے او اُجالے کی آگ کے شعلے!

تو کیوں ہے میرے شبستاں میں آج رقص کناں؟

مری خرد پہ تو پہرے ہیں کیف و مستی کے
مگر تو کون سے رستے سے آگیا ہے یہاں

مجھے نہ چھیڑ کہ ان کیف رنگ راتوں میں
مری نظر کو ستاروں کے پھول چننے ہیں
مرے حسین خیالوں کی اپسراؤں کو
نشے میں تیرتے سپنوں کے جال بننے ہیں

میں خود فریب اگر ہوں تو خود فریب سہی
فریب ایک کھلونا ہے زندگی کے لیئے
مگر یہ تیری شعاعیں، یہ زہر کے نشتر
چبھو کے اپنی نگاہوں میں کوئی کیسے جیئے

یاد

فکر و احساس کے دُھندلکے میں
وقت کی زندگی سمٹ آئی
حافظے کے خموش گنبد میں
دفعتاً ایک گونج لہرائی

گُونج لہرائی اور لہرا کر
ڈھل گئی خامشی کے سانچے میں

اُٹھی اِک لہر اور ڈوب گئی
ذہن کے کھُردرے کنارے پر

ذہن کے کھنڈرات سے ڈھانچے ہیں

جس طرح روشنی کی ایک کرن
بے کراں ظلمتوں میں کھو جائے
یا کوئی رینگتا ہُوا چشمہ
ریگ زاروں میں جذب ہو جائے

غزل

گلشن کی پُر کیف فضا میں بے خُود ہو کر جھُوم رہا ہوں
پھُولوں کا تو ذِکر ہی کیا ہے کانٹوں کو بھی چُوم رہا ہوں

پھُول، شگوفے پھیکے پھیکے چاند ستارے مدّھم مدّھم
فطرت بھی مغمُوم رہی ہے جب تک میں مغمُوم رہا ہوں

گلچیں! تُو نے بے رحمی سے توڑ کے جن کو پھینک دیا تھا
دیکھ ذرا میں ان پھُولوں کو کس حسرت سے چُوم رہا ہوں

جن گلیوں میں تُو نے مجھ سے کچھ جھُوٹے اقرار کئے تھے

اَب بھی بحالِ افسردہ میں اُن گلیوں میں گھُوم رہا ہُوں

تیری یاد میں جو لکھّے تھے اپنے ان اشعار کو پڑھ کر

آنکھیں تو ہیں اشک بداماں لیکن پھر بھی جھُوم رہا ہُوں

موسمِ دلکش، ساقیٔ گلرو، صحنِ گلستاں، بادۂ رنگیں

اس ماحول میں رہ کر بھی میں شاد بہت مغمُوم رہا ہُوں

زندگی

کھویا کھویا سا اکیلا سا فسردہ سا کھنڈر

دم بخود۔ درد بہ جاں۔ مُہر بہ لب ہے ایسے

ڈوب کر فکر و تحیّر کے گھنے گہرے میں

اک متفکّر ہے کہ کچھ سوچ رہا ہے جیسے

خوف کے ناگ ہر اک سمت ہیں پھن پھیلائے

ظلمتیں بال بکھیرے ہوئے پھرتی ہیں یہاں

کتنی مدقوق تمناؤں کے سُوکھے ڈھانچے

ایک خاموش سے لہجے میں ہیں فریاد کناں

وقت، اِک بھُوک کی ماری ہُوئی ڈائن کیطرح

چاٹتا جاتا ہے احساس کے لاشے کا لہُو

اور ان تیرہ فضاؤں میں گھُلی جاتی ہے

زہر میں لپٹی ہوئی ایک سبک رنگ سی بو

دیکھ کر اتنی سیہ اور بھیانک راہیں

کون سمجھے گا بھلا کس کو یہ آئے گا خیال

جگمگاتے ہُوئے عارض کی شعاعیں لے کر

ان پہ بھی گذرے ہیں کچھ ماہ وش برق جمال

غزل

نقاب اٹھا دی اگرچہ تُم نے مگر میں دیکھوں تمہیں تو کیونکر
تمہارے جلووں کی روشنی میں بھٹک رہی ہیں مری نگاہیں

عجیب منزل ہے ان کی منزل پتہ نہیں خضر کو بھی جس کا
مُسافروں کا تو ذکر کیا ہے کہ خود بھی گم ہو گئی ہیں راہیں

مرے تخیّل کا ماحصل ہیں مرے تصوّر کی زندگی ہیں
دراز گیسو حسین آنکھیں جمیل چہرہ۔ گداز باہیں

خوشی کے نغموں میں کارفرما بشر کی بے چارگی کے نوحے
ہر اک تبسّم کی تہ میں آنسو ہر اک مسّرت کی تہ میں آہیں

جسے حسیں تو سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت حسیں نہیں ہے
فریب خوردہ ترا تخیّل فریب خوردہ تری نگاہیں

نظامِ عالم بدل رہا ہے خُدا ابھی شاید نیا بنے گا
نئے نئے سے ہیں سب مجاور نئی نئی سی ہیں خانقاہیں

رہِ طلب میں جو تھک کے بیٹھے مری نظر میں وُہ بوالہوس ہے
رہِ طلب میں قیام کیسا رہِ طلب میں کہاں پناہیں

تعارف

"آپ کا نام پُوچھ سکتا ہوں؟"
"مجھ کو انور ظہُور کہتے ہیں!"
"آپ کیا شاعری بھی کرتے ہیں؟"
"واہ کیا بات کی اجی قبلہ!
میں تو وہ لاجواب شاعر ہوں
جس کے عشرت نواز شعروں میں

اُن حقائق کا دل دھڑکتا ہے
جو اچھوتے ہیں بُوئے گُل کی طرح
مَیں نے لکھّی ہیں سینکڑوں نظمیں
دس کتابوں کا بھی مصنّف ہوں"
"خُوب، تو لکھ چکے بہُت کچھ آپ
کہیئے تو، مال کچھ بکا بھی ہے؟"

"ہاں، وراثت کی جائیداد تمام
رفتہ رفتہ میں بیچ بیٹھا ہُوں"

پبلشر

آپ کی بے شمار نظموں میں
ایک بھی نظم جان دار نہیں
آپ کی شاعری ہے فرسودہ
ایک بھی شعر پر بہار نہیں

آپ یہ جانتے نہیں شاید
اس زمانے میں نام بکتا ہے

جو بہت نام دار شاعر ہیں
صرف انہیں کا کلام بکتا ہے

آپ گمنام آدمی ہیں ابھی
اس لئے آپ کا یہ مجموعہ
از سرِ نو درست کروا کر
اپنے ہی نام سے میں چھاپوں گا

رہ گیا اب معاوضے کا سوال
نقد لینا کوئی ضرور نہیں
شام کے وقت آپ آ جائیں
میکدہ اس جگہ سے دور نہیں!

نقّاد

۱

یہ نئی شاعری بھی خوب رہی

اتنی بے ربط۔ اتنی بے معنی

اتنی بہتات حشو و زائد کی

قافیہ ہے کہیں نہ کوئی ردیف

کوئی مصرع بڑا کوئی چھوٹا

بعض اشعار میں شتر گربہ

ذم کا پہلو ہر ایک مصرعے میں

اور پھر ساری نظم کا مضموں

اس قدر فحش، اس قدر عریاں

کیا اسی شے کا نام جدّت ہے؟

کون ان چھوکروں کو سمجھائے

فکر و احساس کا ہے آئینہ

شاعری کوک شاستر تو نہیں

۲

یہ پرانے زبان داں شاعر

غالب و ذوق کے زمانے کی

کہہ رہے ہیں گھِسی پٹی باتیں

کچھ تاثر نہیں تخیّل میں

آج کی شاعری ہے پَر افشاں

زندگی کی کھُلی فضاؤں میں

اَور یہ لوگ قید ہیں اَب تک

آہنی قافیوں کے زنداں میں

اور فعولن فعول کے گز سے

جانچتے ناپتے ہیں شعروں کو

کون سمجھائے ان بزرگوں کو

شاعری نغمگی کا ٹکڑا ہے

ضرب و تقسیم کا سوال نہیں

غزل

اشکوں میں حسن و رنگ سموتا رہا ہوں میں
آنچل کسی کا تھام کے رو تا رہا ہوں میں

موجوں کا اضطراب گوارا نہ تھا مجھے
کشتی کو اپنے آپ ڈبوتا رہا ہوں میں

نکھرا ہے جا کے اب کہیں چہرہ شعور کا
تا دیر اسے شراب سے دھوتا رہا ہوں میں

احساس اور وہ بھی فلاکت کے دور میں

اک تیر اپنے دل میں چبھوتا رہا ہوں میں

اللہ رے عہدِ شوق کی راحت پسندیاں

سر رکھ کے اُن کی گود میں سوتا رہا ہوں میں

آنکھیں بھی خشک اور لبوں پہ بھی خامشی

یوں بھی کسی کی یاد میں روتا رہا ہوں میں

آزادی

نغمہ افروز فضاؤں پہ مسلّط ہے سکوت
ایک وحشت سی در و بام پہ لہراتی ہے
تیرگی ایک مچلتے ہوئے دریا کی طرح
موج در موج ہر اک سمت بڑھی آتی ہے

اُجڑے اُجڑے ہوئے خاموش سے بازاروں میں
رقص کرتا ہے سُلگتے ہوئے ملبوں کا دُھواں

شاہراہوں پہ بنی نوع کے مُردہ ڈھانچے
اپنی چُپ چاپ زبانوں سے ہیں فریاد کناں

بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی اندھی مخلوق
مذہب و نسل کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اک نئے دَور کے خوابوں کا اثاثہ لے کر
کینہ و بغض کے شعلوں سے جلی جاتی ہے

ہائے یہ لوگ کہ آزاد بھی ہو کر ان ہیں
اپنا ماحول بدلنے کی فراست ہی نہیں
ان کی شریانوں میں جاری ہے غلامی کا لہُو
ان کے سینوں میں ابھی جذبۂ غیرت ہی نہیں

کون ان خاک میں رَوندے ہوئے ایوانوں پہ
اپنی آزاد حکومت کا علم لہرائے
اور اِن خون سے کفنائی ہوئی لاشوں پہ
جشنِ آزادیٔ جمہور کے نغمے گائے

غزل

ہونٹوں کی مسکان میں ڈھل کے
غم آیا ہے بھیس بدل کے
دیکھ کے تجھ کو سوئی آشا
جاگ اٹھی ہے آنکھیں مل کے
تیرے پیار بھرے نینوں میں
آنسو ہیں یا شعر غزل کے

من میں تیرے پریم کی یادیں
آگ میں چھینٹے امرت جل کے
غمِ دُنیا کے ہم دونوں کو
انگاروں میں پھول کنول کے
نکھرا ہے چندن کا چہرہ
ارمانوں کی آگ میں جل کے
آج کے پھیلے اندھیارے میں
دیکھ رہا ہوں سپنے کل کے
دل کی آہیں گیت بنی ہیں
شاد مرے شعروں میں ڈھل کے

کھنڈر

بجھ چکے عمر کے سینے میں محبت کے چراغ
ہو چکی سرد مچلتے ہوئے جذبات کی آگ
چھا گئی ایک اداسی ہی اداسی دل پر
وقت نے لوٹ لیا شوخ اُمنگوں کا سہاگ

زندگانی کے حسیں اور جواں ہنگامے
اپنا دم توڑ چکے روح کی گہرائی میں

بے خود و مست جوانی کے سہانے لمحے
راستہ بھول گئے وقت کی پہنائی میں

اکثر اوقات خموش اور سیہ راتوں میں
میرے ماضی پہ مرے حال کا دل روتا ہے
منجمد سینے کی ہر نرم سی دھڑکن پہ مجھے
موت کے پاؤں کی آہٹ کا گماں ہوتا ہے

جگمگاتے ہوئے ماضی کی خیالی کرنیں
ذہنِ تاریک کو پُر نور نہیں کر سکتیں
ایک ظلمت جو مری زیست پہ لہراتی ہے
وہ کسی طرح اسے دور نہیں کر سکتیں

اک گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے فضاؤں پہ محیط
روحِ احساس پریشان ہوئی جاتی ہے
جس قدر پھیلتا جاتا ہے خموشی کا فسوں
زندگی اور بھی سنسان ہوئی جاتی ہے

غزل

کون سلگتے آنسوؤں کے آگ کے ٹکڑے کون چبائے

ہم کو سمجھانے والے کوئی تجھے کیونکر سمجھائے

برکھا برسے۔ نغمے گونجیں شیشے سے شیشہ ٹکرائے

کون اسوقت انجام کی سوچے کون خرد کے پھیر میں آئے

جیون کے اندھیارے پتھ پر جس نے تیرا ساتھ دیا تھا

دیکھ کہیں وہ کومل آشا آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے

اس دنیا کے رہنے والے اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
کون پرایا روگ خریدے کون پرایا دُکھ اپنائے

ہائے مری مایوس اُمیدیں وائے مرے ناکام ارادے
مرنے کی تدبیر نہ سُوجھی جینے کے انداز نہ آئے

پریم کی اندھیاری راہوں میں عقل کا دیپک جل سکیگا
اَے فرزانو! اَے فرزانو!! ہوش سے کہدو ہوش میں آئے

اس دُنیا کے غم خانے میں غم سے اتنی فرصت کب ہے
دل ستاروں کا مُنہ چومے کون بہاروں میں لہرائے

ضبط بھی کب تک ہو سکتا ہے صبر کی بھی اک حد ہوتی ہے
پل بھر چین نہ پانے والا کب تک اپنا روگ چھپائے

شاد وہی آوارہ شاعر جس نے تجھ سے پیار کیا تھا
نگر نگر میں گھوم رہا ہے ارمانوں کی لاش اٹھائے

پچھتاوا

مری حیات! مری کائنات کی رانی!!
بکھیرنے تھے مجھے پھول تیری راہوں میں
نکھارنے تھے مجھے نقش تیرے چہرے کے
انڈیلنے تھے اُجالے تری نگاہوں میں

میں شرمسار ہوں لیکن کہ مرا عزم جواں
شراب و شعر کی رعنائیوں میں کھو یا رہا

تصوّرات کے فردوس کی بہاروں میں
کسی حسین بدن سے لپٹ کے سو بارہا

کھلی جب آنکھ جب احساس سے اُٹھے پردے
ترے شباب میں وہ مستیٔ شباب نہ تھی
ترے جمال میں پہلا سا رنگ روپ نہ تھا
ترے جلال میں پہلی سی آب و تاب نہ تھی

میں جانتا ہوں حوادث کے آہنی پنجے
تری اُبلتی جوانی کا رس نچوڑ گئے
اُڑا کے لے گئے خوشبو لبوں کے پھولوں کی
نشے میں جھولتی آنکھوں کے جام توڑ گئے

مرا ضمیر ہے مجرم تری تباہی کا
میں تجھ سے آنکھ ملاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں

مرا شعور مرا ساتھ چھوڑ دیتا ہے
میں جب بھی تیری حقیقت پہ غور کرتا ہوں

غزل

گو ظاہراً وہ رسم و راہ دوستی نہیں
تو ہم سے بے نیاز ہو یہ بات بھی نہیں

ہم تو سمجھ چکے ہیں تجھے سانس سانس ہیں
یہ اور بات ہے کہ تجھے آگہی نہیں

کیا ہو سکے گا اس کا مداوا شراب سے
یہ زندگی کا غم ہے غمِ عاشقی نہیں

احساس مر چکا ہے حوادث کی گود میں
اب غم کا غم نہیں ہے خوشی کی خوشی نہیں

کچھ مطمئن ہو جس سے مذاقِ جدید بھی
دُنیائے حسن و عشق میں وہ دلکشی نہیں

اللہ رے ناامیدیٔ پیہم کی ظلمتیں
شب تو ہے شب سحر میں بھی تابندگی نہیں

اہلِ وفا میں ایسے بھی کچھ نامراد ہیں
جن کو تری جفا بھی میسّر ہوئی نہیں

کس سادگی سے پوچھ رہے ہیں وہ حالِ دل
جیسے یہ سرگزشت انہیں معلوم ہی نہیں

طُوفانِ غم کی تند ہواؤں کے باوجود
اک شمعِ آرزو ہے جو اب تک بجھی نہیں

اے شاد بات کیا ہے کہ بزمِ حیات میں
شمعیں تو جل رہی ہیں مگر روشنی نہیں

یہ کون سا مقام ہے اے جذبِ آرزو
وہ سامنے ہیں اور نظر بے قرار ہے

کھلونا

میرے ہونٹوں کے مہکتے ہوئے نغموں پہ نہ جا
میرے سینے میں کئی طرح کے غم پلتے ہیں
میرے چہرے پہ دکھاوے کا تبسم ہے مگر
میری آنکھوں میں اداسی کے دیئے جلتے ہیں

جھانک کر دیکھ مری رُوح کی پہنائی میں
کتنے غمناک فسانے ہیں پراگندہ نقاب

کتنی ناپاک نگاہوں نے لٹیروں کی طرح
میرے احساس سے چھینا ہے تقدس کا حجاب

کتنے انسان محبت کا لبادہ اوڑھے
میرے عارض کے سبُو پی کے مجھے چھوڑ گئے
کتنے ہاتھوں نے نچوڑا ہے مری زلفوں کو
کتنے بھونرے مرا رس چوس کے منہ موڑ گئے

اک نیا خوف بڑھاپے کا تصور بن کر
کھٹکھٹاتا ہے مرے ذہن کے دروازوں کو
گھات میں بیٹھی ہوئی وقت کی جادوگرنی
ڈھونڈھ لے گی مری زیست کے سب غازوں کو

لیکن ان تلخ حقائق سے تجھے کیا لینا
تو بھی آیا ہے کسی دُکھ کا مداوا کرنے
تو بھی آیا ہے کھنکتے ہُوئے سکّے لے کر
تو بھی آیا ہے مرے جسم کا سودا کرنے

غزل

دل پہ جب کوئی چوٹ کھاتے ہیں
اہلِ دل اَور مُسکراتے ہیں
دیکھ کر تیری مَست آنکھوں کو
میکدے خود بھی جُھوم جاتے ہیں
ان کا یہ رشک کتنا پیارا ہے
جو تجھی سے تجھے چھپاتے ہیں

اے غمِ زندگی اداس نہ ہو

آ تجھے ہم گلے لگاتے ہیں

اہلِ دل زندگی کی ظلمت میں

خونِ دل سے دیئے جلاتے ہیں

اپنی دُنیا کے دِل رُبا جلوے

جنتوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں

ہم ہیں وہ رہروِ حیات جنہیں

راہ زن راستہ دکھاتے ہیں

ہائے وہ لوگ جو سمجھ کر بھی

دوستوں کے فریب کھاتے ہیں

شادؔ کے شعر تیرہ ذہنوں میں

صُبح کی طرح جھلملاتے ہیں

غزل

جو نگاہیں محرمِ رازِ گلستاں ہو گئیں
ہر مہکتے پھول کی رگ رگ میں کانٹے بو گئیں

آرزوئیں اژدہامِ رنگ و بو میں کھو گئیں
یہ وہ پریاں تھیں جو بدمستی میں عریاں ہو گئیں

ایک جلوہ بن کے جلووں ہی میں شامل ہو گئیں
پھر کہاں پلٹیں وہ نظریں تیری جانب جو گئیں

ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں
عمر بھر بے خوابیاں میرا مقدّر ہو گئیں

جب بہاروں نے نہ پایا کوئی بھی اپنا مقام
تیرے ہونٹوں کے تبسم سے لپٹ کر سو گئیں

ہائے وہ الھڑ پری چہروں کے شیریں قہقہے
ہائے وہ ہنستی ہوئی راتیں جو مجھ سے کھو گئیں

اُداسی

چند موہوم سی یادوں کے سیہ فام بھنور
تیرنے لگتے ہیں ادراک کی پہنائی میں
پھوٹ پڑتا ہے فضاؤں سے اندھیرے کا غبار
اَور پھر پھیلتا بڑھتا ہُوا بل کھاتا ہُوا
اپنے شب رنگ لبادے میں چھپا لیتا ہے
مُسکراتے ہُوئے احساس کے چہرے کا نکھار

یک بیک وقت کی ہر نبض ٹھہر جاتی ہے
اور ویران مزاروں کی گھنی خاموشی
رینگتی، ہانپتی، ظلمت کا سہارا لیتی
روح کے ریشمیں پیکر میں سمٹ آتی ہے
ٹوٹ جاتا ہے جھکتے ہوئے خوابوں کا خمار
اور — دل اپنے خیالات کے گہوارے سے
جھولتے جھولتے چونک اٹھتا ہے، جاگ اٹھتا ہے
پھر کسی حسرتِ بے نام کا دامن تھامے
ایک ٹوٹے ہوئے کمزور سفینے کی طرح
ڈوب جاتا ہے دھندلکوں کے سمندر میں کہیں

غزل

پہلے پہل جب تجھ کو دیکھا کیا جانے کیا آئی من میں
جیون کیاری ایسے مہکی پھول کھلے ہوں جیسے بن میں

میری صورت دیکھنے والے مجھ کو کیا پہچان سکیں گے
تیرا ہی مکھ لہرائے گا۔ میرے جیون کے درپن میں

میری ہر مسکان کی تہ میں کانپ رہے ہیں ٹوٹے آنسو
پت جھڑ کی سی ویرانی ہے میرے جیون کے ساون میں

بھولے من کی بھولی آشا کون اُسے اَب سُلجھائے گا

پیار کی اُلجھن سُلجھا کر تو اُلجھی ہے جس اُلجھن میں

بھول کے بھی جس بے دردی کو میری یاد نہیں آئیگی

میں نے اس کی چاپ سنی ہے اپنے دل کی ہر دھڑکن میں

کاش کوئی سُن سکتا میرے گھائل جیون کی فریادیں

جو برسوں سے گونج رہی ہیں اِن نینوں کے سونے پن میں

آشاؤں کی بیرن دُنیا! تو نے جس کو توڑ دیا ہے

تیرے سارے غم پلتے تھے شاد کے اس کومل سے من میں

تصادم

اس سے پہلے کہ سرِ عام خرید اجائے
میری معصوم سلیمہ کے تقدّس کا غرور
اور بک جائے فقط چند ہی سکّوں کے عوض
اس کے چہرے کی ضیا اس کی نگاہوں کا سرور

اس سے پہلے کہ مرے نقشِ قدم پر چل کر
وہ اسی حسن کے بازار میں عصمت بیچے

اطلسی گالوں کی رعنائی کو رُسوا کر دے
نرم ہونٹوں کی فسوں کار لطافت بیچے

اس سے پہلے کہ امیروں کے شبستانوں میں
میری بیٹی کے تقدس کی ہنسی اُڑ جائے
کاش دُنیا کی ہوسناک نگاہوں سے اُسے
لے اُڑیں دُور کہیں مَوت کے ظالم سائے

کیا ہُوا آج مجھے کیسے خیال آتے ہیں
کیا مرا دل مری بیٹی کا طلبگار نہیں
لیکن اب اس کے سوا میرا سہارا کیا ہے
مَیں تو بوڑھی ہوں مرا کوئی خریدار نہیں

چھلاوا

کتنے افسردہ و بے رنگ سے ایّام کے بعد
آج احساس کے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہے
وقت کی شوخ پری اپنے پَروں پر مجھ کو
جانے کس حُسن کی جنّت میں اُڑا لائی ہے

ہر طرف عطر فشاں ہونٹ شہابی عارض
ہر طرف کالے گھنے گیسو ملائم باہیں

آج ادراک میں جاگے ہیں رسیلے نغمے

آج شاداب ہوئی ہیں مرے دل کی راہیں

آج محسوس ہوا ہے کہ مری آنکھوں میں

غم کی تلخی ہی نہیں ہنستے ہوئے خواب بھی ہیں

زندگی یاس کا بے پایاں اندھیرا ہی سہی!

اس اندھیرے کی تہوں میں کئی مہتاب بھی ہیں

مستیاں رقص میں آئی ہوئی لہروں کی طرح

تیرتی پھرتی ہیں چھلکے ہوئے پیمانوں میں

قمقمے نرم شعاعوں کی لکیریں لے کر

ٹمٹماتے ہیں خیالات کے ایوانوں میں

روح پر پھیلتا جاتا ہے سنہری سا غبار
جھلملاتے ہیں نگاہوں میں ستاروں کے دیئے
اور گلرنگ فضاؤں کی حسیں دوشیزہ
مضطرب ہے مری آغوش میں آنے کیلئے

ہائے یہ کیف در آغوش گلابی لمحے
کاش میں ان کو ہمیشہ کے لئے اپنالوں
اور ستم خوردہ جوانی کے حزیں چہرے سے
زخم ہائے غم دوراں کے نشاں دھو ڈالوں

سراب

جب کبھی مجھ کو تیرا خیال آگیا!
میرے چہرے کی ساری تھکن دُھل گئی
میرے دل میں خوشی کے کنول کِھل گئے
میرے احساس میں چاندنی گُھل گئی

اور پھر اک مچلتے ہُوئے جوش سے
چل پڑا میں تری جُستجو کے لئے

اپنی واماندہ آنکھوں کی محراب میں
کتنی گلرنگ شمعیں فروزاں کیے

جانے کب تک ترے رنگِ رخسار کو
آرزوؤں کے خاکوں میں بھرتا رہا
لے کے تخئیل کے بازوؤں میں تجھے
گیت گاتا رہا ۔ رقص کرتا رہا

یونہی گاتے ہوئے رقص کرتے ہوئے
میں بھٹکتا رہا کتنے صحراؤں میں
روح میں تو امنگیں مہکتی رہیں
اور کانٹے کھٹکتے رہے پاؤں میں

مدّتوں تک تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے

آ ہی پہنچا بالآخر میں تیرے قریں

آنکھ اُٹھا کر جو دیکھا تری شکل کو

مجھ کو ڈسنے لگا میرا خوابِ حسیں

کیا یہی وہ بھیانک خد و خال تھے

جو مرے عزم کو گدگداتے رہے

جن کی خاطر مرے نوجواں ولولے

زندگی بھر مصائب اُٹھاتے رہے

غزل

کانٹوں سے میں نے پیار کیا ہے کبھی کبھی
پھولوں کو شرمسار کیا ہے کبھی کبھی

یا شکوۂ سنجِ جورِ خزاں ہی رہے ہیں ہم
یا ماتمِ بہار کیا ہے کبھی کبھی

اتنا اثر تو ہے کہ مرے اضطراب نے
اُن کو بھی بے قرار کیا ہے کبھی کبھی

اللہ رے بے خودی کہ ترے پاس بیٹھ کر
تیرا ہی انتظار کیا ہے کبھی کبھی

اعجازِ شوق ہے کہ مرے ذوقِ دید نے
جلوؤں کو شرمسار کیا ہے کبھی کبھی

وہ غم جو میری رُوح پہ چھایا ہُوا ہے شاد
شعروں میں آشکار کیا ہے کبھی کبھی!

راکھ

نہ جانے کب سے یُونہی دل شکستہ بیٹھی ہُوں
اُداس چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لئے
گزرنے والی ہے رات اَور میری آنکھوں میں
جلا رہی ہے تری یاد آنسوؤں کے دیئے

مرا خیال تھا ان زرنگار محلوں میں
وُہ دلکشی ہے کہ میں تجھکو بھول جاؤنگی

نئے نشاط کے احساس کی شعاعوں سے
شباب و حسن کی راہوں کو جگمگاؤں گی

مگر خبر نہ تھی یہ شوخ و شنگ ہنگامے
مری جوان امیدوں کا حسن لوٹیں گے
سنہرے خواب خزاں دیدہ پتیوں کی طرح
اُجڑ اُجڑ کے بڑی حسرتوں سے ٹوٹیں گے

میں سوچتی ہوں کہ اک جسم کے پجاری کو
میری وفا نے وفا کا سہاگ کیوں سمجھا
ہوس کے ساز پہ گائے ہوئے ترانے کو
دھڑکتے دل کی محبت کا راگ کیوں سمجھا

یہ سیم و زر کی بہاروں کا دَور بے مستی
مری فسردگیٔ روح کو نہ راس آیا
بجُھی بجُھی سی جوانی تھکی تھکی سی حیات
میں سوچتی ہُوں تجھے کھو کے میں نے کیا پایا

یہ ٹھیک ہے کہ ترا پیار سیم پوش نہ تھا
وفا شناس تھا لیکن وفا فروش نہ تھا

آرٹسٹ

وُہ خواب جن کو تراشا تھا میری آنکھوں نے
تصوّرات کے نور آفریں دھندلکوں میں
سُلگتے ۔ کانپتے ۔ خاموش آنسوؤں کی طرح
جھلک رہے ہیں مری زندگی کی پلکوں میں

ان آنسوؤں کو بھی دے کر ضیا دوبارہ
تمہاری رُوح کی محراب میں جلاتا ہوں

میں زخم زخم ہوں بے شک مگر تمہارے لئے
مہکتے جھومتے پھولوں کے گیت لاتا ہوں

تمہاری خشک نگاہوں کے آبگینوں میں
نچوڑتا ہوں میں قوس قزح کے رنگوں کو
پلا کے اپنے درخشندہ ولولوں کا لہو
نکھارتا ہوں تمہاری حسیں اُمنگوں کو

میں اپنے ساز کے نغموں کی نرم لہروں میں
تمہارے چہروں کی افسردگی ڈبوتا ہوں
مگر خود اپنی جوانی کی آرزوؤں پر
تمہارے بعد اکیلا ہی چھپ کے روتا ہوں

یہ میرا فن جو تمہارے دلوں کا غازا ہے
مرے شباب کے جذبات کا جنازا ہے

میں پھول چننے آیا تھا باغِ حیات میں
دامن کو خارزار میں الجھا کے رہ گیا

غزل

اس میں جب تک کسی کی آس نہ تھی
دل تھا اک پھول جس میں باس نہ تھی
زخم گہرے نہیں تھے جب دل کے
درد میں اس قدر مٹھاس نہ تھی
مجھ سے ملنے سے پیشتر وہ نظر
میں تو کیا خود سے روشناس نہ تھی

آپ ہی کا یہ فیض ہے ورنہ
زندگی اس قدر اداس نہ تھی

وہ بھی کیا دور تھا کہ شاد ہیں
غم تو غم ہے خوشی بھی راس نہ تھی

اُلجھن

یُوں تو خاموش ہُوں لیکن تری زُلفوں کی طرح
آج میرے بھی خیالات پریشان سے ہیں
دِل کی مایُوس تمنّاؤں کے گھائل پنچھی
اپنی بے سُود اُڑانوں پہ پشیمان سے ہیں

مَیں نے سوچا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا
تیرے ماحول کی ظُلمت سے نِکالوں گا تُجھے

تیری سانسوں میں جلا کر مہ و انجم کے دیئے

اپنے ہر خواب کی تعبیر میں ڈھالوں گا تجھے

میں نے سوچا تھا، مری سوچ کے شعلے لیکن

سنگدل وقت کے آئین کو پگھلا نہ سکے

آرزوؤں سے علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا

ولولے کاکلِ حالات کو سلجھا نہ سکے

پھر بھی تو دیکھ کہ بربادِ تمنّا ہو کر

اک مرا دِل ہے کہ آمادۂ فریاد نہیں!

جیسے احساس کی دولت سے بھی عاری ہوں میں

جیسے بیداد بھی میرے لئے بیداد نہیں

اور تو ایک لٹے ہارے جواری کی طرح
اپنے سینے میں کئی زخم لئے بیٹھی ہے
شوخ آنکھوں میں بلکتے ہوئے سپنے لیکر
عنبریں بال پریشان کئے بیٹھی ہے

کاش تو اتنا سمجھتی کہ تری روح کا غم
اپنی ناکام جوانی کی تلافی تو نہیں!
زندگی کا یہ کڑا دور بدلنے کے لئے
اپنے آلام پہ رو لینا ہی کافی تو نہیں

مُستقبل

وہ دِن دُور نہیں جب ساتھی !

دُور افق کے دروازوں سے
جھانکے گی اِک صُبح نرالی
اور اندھیاری کٹیاؤں پہ
چھا جائے گی سُندر لالی

اس لالی کی سُندرتا سے

نیند کے ماتے جاگ اُٹھیں گے

دھرتی کے انیائے نگر سے

کالے زہری ناگ اُٹھیں گے

بھوک کا اک سیلاب بڑھے گا۔

اور مذہب کے مُردہ ڈھانچے

اس سیلاب میں گل جائیں گے

ہر نگری کے بھُوکے انساں

اک سانچے میں ڈھل جائیں گے

دھرتی کا دل کانپ اُٹھے گا

کشٹ کی جوالا پھُوٹ پڑے گی

ایکا کر کے بھُو کی جنتا
دھنوانوں پر ٹُوٹ پڑے گی
آخر ایسا وقت آئے گا۔

جب راجاؤں کے محلوں میں
تخت نہ ہونگے تاج نہ ہونگے
جن سے خُون کی بُو آتی ہو
وُہ نیلم پکھراج نہ ہوں گے

ہر بستی میں ہر نگری میں
خُود ہی پرجا راج کرے گی
اپنے جیون کے خاکوں میں
آشاؤں کا رنگ بھرے گی

مجبوری

رنگ و نکہت میں سموئے ہُوئے گیتوں کے کنول
تیرہ و تار دُھندلکوں میں بکھیرے میں نے
تیری آنکھوں کو پلا کر مہ و انجم کا لہُو
سُرمئی راتوں کے چمکائے اندھیرے میں نے

تیری مستانہ امنگوں کا اشارہ پا کر
اب بھی میں شوخ و طرب خیز ترانے گاتا

اپنے نغمات کی تانوں کے پروں پر تجھ کو
تیرے سپنوں کے جزیروں میں اُڑا لے جانا

لیکن اب ذہن کے پردوں پر اُبھر آئے ہیں
رُوح کے خُون میں بھیگے ہوئے غم کے سائے
دیرتک اپنی نگاہوں سے چُھپا کر جن کو
میں نے گلرنگ بہاروں کے ترانے گائے

ڈُوب جائے ترے چہرے کی اُداسی جن میں
اَب میں چاہوں بھی تو وہ گیت نہیں گا سکتا
جو تری رُوح کے آنچل میں ستارے بھر دے
میری آواز میں وہ لوچ نہیں آ سکتا

اب میں اک ٹوٹا ہوا ساز ہوں جس کے نغمے
وجد و آہنگ کا عنوان نہیں بن سکتے
گھول سکتے ہیں تری رُوح میں زہراب مگر
تیری تفریح کا سامان نہیں بن سکتے

اب مرے گیت ہیں سنگین حقائق کے نقیب
اب مرے گیتوں میں لہراتے ہوئے خواب کہاں
تیری نظروں کا تجسّس تو بجا ہے لیکن
کوڑھ کے داغ میں تابانیٔ مہتاب کہاں

انحراف

افق سے تا افق ہیں زہر سے بھری سیاہیاں
نظر نظر لہو لہو نفس نفس دُھواں دُھواں
فغاں کہ لُٹ گیا ہے اپنی آرزو کا کارواں

کوئی بھی راہ بر نہیں کوئی بھی پیش رو نہیں
فروغِ تیرگی ہے یہ طلوعِ صبحِ نو نہیں

بہار آ گئی مگر فضائیں پُر ملال ہیں

کلی کلی ہے سوگوار پھول پائمال ہیں
خزاں نصیب زندگی کے ولولے نڈھال ہیں

دل و نگاہ میں ابھی طرب کی کوئی لَو نہیں
فروغِ تیرگی ہے یہ طلوعِ صبحِ نو نہیں

بچھا ہوا ہے چار سُو نظامِ زر کا دام ابھی
اسیر ہیں خیال و فکر ذہن ہیں غلام ابھی
رُکو نہ میرے ساتھیو کہ دُور ہے قیام ابھی

رُکو نہ میرے ساتھیو یہ ضو سحر کی ضو نہیں
فروغِ تیرگی ہے یہ طلوعِ صبحِ نو نہیں

کشمکش

سوچتے سوچتے پھر مجھ کو خیال آتا ہے
وہ مرے رنج و مصائب کا مداوا تو نہ تھی
رنگ افشاں تھی مرے دل کی خلاؤں میں مگر
ایک عورت تھی علاجِ غمِ دنیا تو نہ تھی

میرے ادراک کے ناسور تو رستے رہتے
میری ہو کر بھی وہ میرے لئے کیا کر لیتی

حسرت و یاس کے گھمبیر اندھیرے میں بھلا
ایک نازک سی کرن ساتھ کہاں تک دیتی

اُس کو رہنا تھا زر و سیم کے ایوانوں میں
رہ بھی جاتی وُہ مرے ساتھ تو رہتی کب تک
ایک مغرور سَہوکار کی پیاری بیٹی
بھُوک اَور پیاس کی تکلیف کو سہتی کب تک

ایک شاعر کی تمنّاؤں کو دھوکا دے کر
اس نے توڑی ہے اگر پیار بھرے گیت کی لے
اس پہ افسوس ہے کیوں اس پہ تعجب کیسا؟
یہ محبّت بھی تو احساس کا اِک دُھوکا ہے

پھر بھی انجانے میں جب شہر کی راہوں پہ کہیں
دیکھ لیتا ہوں میں دوشیزہ جمالوں کے ہجوم
رخ پہ پھیلنے لگتا ہے اُداسی کا غبار
ذہن میں رینگنے لگتے ہیں خیالوں کے ہجوم

سوچتے سوچتے پھر مجھ کو خیال آتا ہے
وُہ مرے رنج و مصائب کا مداوا تو نہ تھی
رنگ افشاں تھی مرے دل کی خلاؤں میں مگر
ایک عورت تھی علاجِ غمِ دُنیا تو نہ تھی

لیڈر

تُو نے بے علم دماغوں کے نہاں خانوں میں
کینہ و بغض کی مسموم سیاہی گھولی
اور انسان ترے سحر سے بے خود ہو کر
کھیلنے لگ گئے اپنے ہی لہُو سے ہولی

کائنات اپنی رگیں پھاڑ کے چِلّا اٹھی
نکہت آمیز فضاؤں کے کلیجے دھڑکے

خون اُگلنے لگیں مدفوق عبادت گاہیں

آسماں بوس عمارات سے شعلے بھڑکے

اوفسوں ساز! یہ مانا ترا مذہب کا فسوں

آج چلتا ہے ہمیشہ تو نہیں چل سکتا

مذہب اور قوم کی گرتی ہوئی دیواروں سے

قحط اور بھوک کا طوفان نہیں ٹل سکتا

زنگ آلود سہی پھر بھی عوامی جذبے

رنگ اور نسل کے پابند رہیں گے کب تک

اور صدیوں کے سیہ بخت ستم خوردہ بشر

نت نئے ظلم نئے جور سہیں گے کب تک

قائدِ قوم! جنوں خیز فضاؤں سے نہ کھیل
لال پریوں کے چھلکتے ہوئے خوابوں میں نہ جھوم
وقت کی ایک ہی کروٹ کے بدل جانے سے
تیری جانب بھی لپک سکتے ہیں بھوکوں کے ہجوم

گونج

زندگی! تو ہی نہ ماضی کے بھنور سے نکلی
ورنہ اس دورِ سیہ فام میں کیا رکھا تھا
آہیں بھرتی ہوئی ناکام امیدوں کے سوا
تیرے بیتے ہوئے ایّام میں کیا رکھا تھا

زندگی! ایک ہی صدمہ سے پریشاں ہوکر
اپنے جذبات کے پر کاٹ دئے ہیں تو نے

غمِ جاناں بھی کوئی غم تھا کہ جس کی خاطر
مُدتوں زہر بھرے جام پیئے ہیں تُو نے

زندگی! تُو نے ہی چاہا نہیں ورنہ اب تک
میری گیت تری رُوح میں گھُل سکتے تھے
مست آنکھوں کا غم و حزن بھی مٹ سکتا تھا
شوخ چہرے کے سیہ داغ بھی دُھل سکتے تھے

زندگی! اب بھی نئے عزم نئے جوش کے ساتھ
اپنی ٹھٹھری ہُوئی دُنیا سے بغاوت کر دے
اور ادراک کی ہنستی ہوئی دیواروں سے
نوچ کر پھینک دے ماضی کے بھیانک نقشے

زندگی! وقت کے بے رنگ دھوئیں کے پیچھے

اب بھی جلتے ہیں ترے واسطے گلرنگ دیے

اب بھی مستقبلِ روشن وہ سجیلا دلہا

منتظر ہے ترے سینے سے لپٹنے کے لیے

غزل

جہانِ شوق کو پھر سے جواں بنانا ہے
نئی زمین نیا آسماں بنانا ہے

کہاں یہ تابِ تکلّم کہ عرضِ حال کریں
حضورِ دوست نظر کو زباں بنانا ہے

یہ رسم و راہِ محبّت نہیں نہ ہو لیکن!
نئی جبیں کو نیا آستاں بنانا ہے

جمی ہوئی ہے ابھی جن پہ گردِ مایوسی
انہیں لبوں کو تبسّم فشاں بنانا ہے
ابھی حیاتِ فسردہ کے حُسنِ سادہ کو
نکھارنا ہے ہمیں جاوداں بنانا ہے
پیام دے کے مہکتی ہوئی بہاروں کا
خزاں زدوں کو حریفِ خزاں بنانا ہے
جبینِ شوق کے زخموں سے دل کے داغوں سے
ہر ایک دشت ہمیں گلستاں بنانا ہے
ابھرنے والا ہے دھندلے افق کے کہرے سے
وہ ایک لمحہ جسے جاوداں بنانا ہے
شعورِ مُردہ ہے ماحول کا جبھی تو ہمیں
ہر ایک شعر کو برقِ تپاں بنانا ہے

منگیتر

میں جانتا ہوں ترے دل کے آبگینے میں
نئی نویلی اُمنگیں جھلک رہی ہوں گی
نفس نفس میں گلستاں مہک رہے ہوں گے
نظر نظر میں شرابیں چھلک رہی ہوں گی

ترے جمال کی دوشیزگی کے سائے میں
تبسّموں کے دیئے جھلملا رہے ہوں گے

نئے خیال نئے ولولے نئے جذبے
تصوّرات کو جھولا جھلا رہے ہوں گے

مگر یہ کیسے بتائے تجھے کوئی کہ ابھی
میں تیرے خواب کی تعبیر بن نہیں سکتا
مرا شعور جسے تلخیوں نے پالا ہے
نشاط و کیف کی تصویر بن نہیں سکتا

ابھی تو میری ستم کوش زندگی کے لئے
صعوبتیں ہیں حکومت کے قید خانے ہیں
قدم قدم پہ ہیں پہرے مری مسرّت پر
روش روش پہ مری موت کے بہانے ہیں

گزر رہا ہوں میں ان آتشیں مراحل سے
جہاں حسین خیالوں کے پنکھ جلتے ہیں
کہیں غلیظ وباؤں کا دَور دَورہ ہے
کہیں گھناؤنے فاقوں کے ناگ پلتے ہیں

کہاں کا دردِ محبّت کہاں کا شوقِ جمال
بغاوتوں کے شرارے ہیں میرے سینے میں
الجھ رہا ہے جو ظلمت کے تند طوفاں سے
سوار ہوں میں اسی نور کے سفینے میں

یہ ٹھیک ہے کہ انہیں ظلمتوں کے گھیرے سے
مچل کے پھوٹنے والی ہے تابناک سحر

میں اپنے عزم و عمل سے شکستہ دل تو نہیں
سفینہ پار تو اترے گا بالضرور — مگر

ابھی کہاں ہے مرے ذہن میں وہ رنگینی
جو تیرے حسن کی رعنائیاں نکھار سکے
تراش کر ترے خوابوں کی شوخ تعبیریں
تری لجیلی امنگوں کا دل ابھار سکے

شہید

مرے رفیقو!

مری امیدوں کے پاسدارو!!

تمہارا ساتھی ہوں میں ازل سے

تمہارا ساتھی ہوں میں ابد تک

دمک رہا ہوں تمہاری آنکھوں کی روشنی میں

مچل رہا ہوں تمہارے سینوں کی دھڑکنوں میں

تڑپ رہا ہوں تمہارے جذبوں کی سرکشی میں
مرے لئے کیوں فسردہ دل ہو مرے رفیقو!
نظر کی محدود وسعتوں میں نہیں ہے میرا مقام لیکن
مَیں زندگی کے وقار کا راز داں ہوں میرا وجُود ہے جاوداں حقیقت
مَیں آج تک مَر نہیں سکا ہوں —— نہ مر سکُوں گا
میں جاوداں ہُوں
مَیں بے نیازِ اجل رہا ہوں۔ مَیں بے نیازِ اجل رہُوں گا
مرے رفیقو!
مرے دہکتے لہُو کے چھینٹے
جو میرے عزمِ بلند و بالا کے راز داں ہیں
جو رستے پھُوٹے ہیں رات کے سرمئی بدن پر
میں دیکھتا ہُوں چراغِ رہ بن کے جل رہے ہیں

مجھے یقین ہے کسی سویرے کی سُرخ کرنوں میں ڈھل رہے ہیں

کسی سویرے کی سُرخ کرنیں

جو توڑ ڈالیں گی رات کی ظُلمتوں کا جادُو

کسی سویرے کی سُرخ کرنیں کہ جن کی ضو میں

یہ چاند تاروں کی تھرتھراتی ہُوئی قطاریں نہ رہ سکیں گی

یہ اُجڑی اُجڑی ہُوئی بہاریں نہ رہ سکیں گی

کسی سویرے کی سُرخ کرنیں

جو تُم کو دیں گی تبسّمِ گُلفشاں کا مژدہ

مرے رفیقو!

مرے لئے تُم اُداس کیوں ہو؟

غزل

دماغ سوختہ سا دل پہ گرد سی کیا ہے
یہ زندگی کا تمسخر ہے زندگی کیا ہے

جلا وہ شمع کہ ماحول جگمگا اُٹھے!
یہ نیم خواب فضاؤں پہ دُھند سی کیا ہے

قدم بڑھا کہ نئی منزلیں بلاتی ہیں
یہ بے حسی۔ یہ تھکن۔ یہ شکستگی کیا ہے

جھلک اُٹھیں گے یہ ذرّے ہی مشعلوں کی طرح
تری نگاہ سلامت یہ تیرگی کیا ہے

جمود توڑ کوئی اضطراب پیدا کر
سکون سے جو بسر ہو وہ زندگی کیا ہے

اُٹھے گا کیا کوئی طوفان بحرِ ہستی میں
یہ انتظار سا کیوں ہے یہ خامشی کیا ہے

نہ دیکھ چشمِ حقارت سے خشک کانٹوں کو
گلوں سے پوچھ مآلِ شگفتگی کیا ہے

یہ تیرہ فام اُجالا ہے صُبحِ کاذب کا
ابھی تو ہوگا طلوعِ سحر ابھی کیا ہے

مچل رہے ہیں ارادے نکھر رہا ہے شعور
اب انقلاب کے آنے میں دیر ہی کیا ہے

سخن وری نہیں بے گرمیٔ سخن اے شاد
جو شعلہ بن کے نہ بھڑکے وہ شعر بھی کیا ہے

خُدا

میری مخلوق نے تخلیق کیا ہے مجھ کو

ذرّے

انہیں ذرّوں نے سنوارا رُخِ گیتی کا جمال
انہیں ذرّوں نے جلائے ہیں تمدّن کے دیئے
انہیں ذرّوں نے تواریخ کے پھیکے عارض
اپنے چہروں کی تب و تاب سے گلریز کئے

انہیں ذرّوں کے درخشندہ لہُو کی سُرخی
ہر نئے چاند کی روداد کا عنوان بنی

کبھی چمکاتی رہی مذہب وملّت کے ضمیر
اور کبھی تخت کی تزئین کا سامان بنی

انہیں ذرّوں نے سیہ رات کی خوں ریزی میں
جنگ کے قحط کے افلاس کے آرام سہے
پھولتے پھلتے رہے شاہ و پیمبر کے چمن
اور یہ بیچارے خزاں رنگ و زبوں حال رہے

ان کی پلکوں پہ جھلکتے رہے اشکوں کے ہجوم
خاک و افلاک پہ چھایا رہا ظلمت کا غبار
ان گنت سال گزرتے گئے جھونکوں کی طرح
ان کی مرجھائی ہوئی زیست پہ آئی نہ بہار

لیکن اب جب کہ نئی صبح کی نذریں ضو سے
تیرگی ختم ہوئی نیند کا جادو ٹوٹا
ان کے سینوں میں بغاوت کے ترانے گونجے
ان کی شریانوں میں احساس کا لاوا پھوٹا

اور یہ ذرّے دہکتے ہوئے شعلوں کی طرح
اپنے احساس کی حدت سے کچھ ایسے بھڑکے
کانپ کر رہ گئے مذہب کے فسردہ ڈھانچے
قصرِ شاہی کے فلک بوس منارے دھڑکے

کون اس بڑھتے ہوئے سیل کو روکے بڑھ کر
کس میں جرأت ہے کہ یہ ناچتے کوندے پکڑے

اُب توجل جائے گا جو راہ میں حائل ہوگا
اُب کوئی چال کوئی جال انہیں کیا جکڑے

اب تو یہ ذرّے کہ ہر دشت میں بحر و بر میں
بڑھتے ہی جائیں گے طُوفان کے دھاروں کی طرح
اک نئے عزم نئے شوق نئے جوش کے ساتھ
وسعتِ ارض پہ چھائیں گے بہاروں کی طرح

اب نہ لہرائے گی ظلمت رُخِ دوراں پہ کبھی
اب نہ انسانوں پہ انسان ستم راں ہوں گے
رات کے ساتھ گئی چاندستاروں کی دمک
اب یہی ذرّے ہر اک سمت فروزاں ہونگے

طلُوع

ہماری جُرأتِ بے باک کے تصوّر سے
دَھڑک رہی ہے زمیں ڈگمگا رہی ہے فَضا
لرَز رہے ہیں چراغِ سحَر کی لو کی طرح
غرُور و کبر کے اصنام سیم و زَر کے خدا

جو چاہتے ہیں کہ اب بھی غموں کے زانو پر
ہمَارا جلتا اُبلتا شعور سوتا رہے

رواں ہے ان کی رگوں میں جو بادۂ رنگیں
ہمارے خون سے اب بھی کشید ہوتا رہے

وہ چاہتے ہیں مگر چاہنے سے کیا ہوگا
جو ڈوب رہے ہیں سفینے ابھر نہیں سکتے
بھڑک رہے ہیں جو شعلے ضمیرِ گیتی میں
وہ آبِ زر سے انہیں سرد کر نہیں سکتے

نظر فریب سہی رنگِ اہلِ سرمایہ
مگر ہمارے ارادوں پہ جم نہیں سکتا
وہ لاکھ چاہیں مگر کارخ کی چٹانوں سے
ہمارے عزم کا طوفان تھم نہیں سکتا

وہ نور پھوٹ چکا ہے افق کے سینے سے
جو دے رہا ہے ہمیں اپنی منزلوں کا سراغ
جو آج کون و مکاں کی فسردہ آنکھوں میں
جلا رہا ہے طرب خیز ولولوں کے چراغ

غریب فاقہ کشو! بے نواؤ!! مزدورو
بڑھو کہ وقت کے رہوار اضطرار میں ہیں
ہمیں ہیں جانِ گلستاں، ہمیں ہیں روحِ چمن
نئی بہاریں ہمارے ہی انتظار میں ہیں

اس انقلاب کو اب کون روک سکتا ہے
جو آرزو کی نئی محفلیں سجائے گا

جو درد بن کے اُٹھا ہے ہمارے سینوں میں
جو کیف بن کے فضائے جہاں پہ چھائے گا!

وقت کی مضطرب نگاہوں میں
کچھ نئے عزم جھلملاتے ہیں
سہمی سہمی ہے سطوتِ شاہی
اونچے ایوان ڈگمگاتے ہیں

غزل

اے چشمِ التفات تری کچھ خطا نہیں
اب میں ہی تیرے پیار کے قابل رہا نہیں

تحریکِ انقلاب کے نغمات کے سوا
اب سازِ دل سے گیت کوئی پھوٹتا نہیں

ہر ہر نفس ہے عزمِ بغاوت لئے ہوئے
کس کے دماغ و دل میں تلاطم بپا نہیں

شعلے بھڑک رہے ہیں ضمیرِ حیات میں

کس کی رگوں کا خُون ہے جو کھولتا نہیں

تیور بتا رہے ہیں اُبھرتی سماج کے

اَب یہ نظامِ آتش و خُوں دیرپا نہیں

روکے جو صُبحِ نو کی شعاعوں کے کارواں

اس جاں بلب سی رات میں یہ حوصلہ نہیں

پلتا ہے میرے فکر و تیقّن کی گود میں

میرے وطن میں حشر جواب تک اُٹھا نہیں

اُس شعر میں کمی ہے شعورِ حیات کی

للکار بن کے ذہن میں جو گونجتا نہیں!

اے وائے زندگی کی کشاکش کی محویت

تُو مجھ سے بے خبر مجھے تیرا پتا نہیں

دُنیا بصد جمال کھڑی دیکھتی رہی
مَیں بے نیازِ حُسن ذرا بھی رُکا نہیں
اے شاد مُسکرا کہ تری منزلِ عمل
حدِّ نظر سے دُور سہی لا پتا نہیں

اجنبی

محترم خاتون! مجھ کو دیکھتے ہی یک بیک
کیوں دہک اٹھی ہیں تیرے حسن کی رعنائیاں
کس لئے تیرے رخِ شاداب کی تحریر پر
چھا گئی ہیں جذبۂ تحقیر کی پرچھائیاں

میں انہیں اجداد کا فرزند ہوں جن کا لہو
جل رہا ہے تیرے گھر کے قمقموں کے روپ میں

پہنچتے آئے جو اب تک تیرا گلزارِ طرب
حادثاتِ زندگی کا چلچلاتی دُھوپ میں

خوف کھا مجھ سے کہ اب میرے خیالوں کی لپک
توڑ سکتی ہے ترے خونی تمدّن کے ستوں
گڑگڑاتا ہے جو تیری بے بصر نظروں سے دُور
میں اسی طوفانِ ہیبتناک کی اک لہر ہُوں

اپنی آنکھوں میں لئے نفرت کا زہریلا غبار
دیکھتی کیا ہے مرے یہ چیتھڑے اے سیم پوش!
سیم و زر کی چار دیواری سے باہر جا کے سُن
بھوک کی ماری ہُوئی جانوں کا طوفانی خروش

دیکھ اُبھر کر اپنے کجلائے ہوئے ماحول سے

میرے جیسے ان گنت محنت کشوں کے کارواں

زرد چہروں پر دمکتے عزم کی زخشندگی

خشک آنکھوں میں بغاوت کی لپکتی بجلیاں

وسعتِ کون و مکاں کی تلملاتی روح میں

گونجتے ہیں انقلابِ نو کی تنہائی کے راگ

پھوٹنے کو ہیں بطونِ شب سے انوارِ سحر

محترم خاتون! اپنے عنبریں خوابوں سے جاگ

اب زیادہ دیر تک انساں کی عظمت کا جمال

لُٹ نہیں سکتا حصارِ نخوت و جبروت میں

اتحادِ بندہ کا یہ بیمار و کہنہ امتیاز

سڑ کے سج جانے کو ہے تاریخ کے تابوت میں

یہ حقارت جس کو پالا ہے تری تہذیب نے

وقت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہ جائیگی

قہقہے ماریں گے صدیوں کے فسردہ ولولے

تیری آبائی رعونت دیکھتی رہ جائے گی!

بلاوا

اُبھر کے دیکھو

کثیف اندھیرے کی زہر آلود دلدلوں سے

وہ جھلملاتے اچھُوتے لمحے

جہاں مرے کیف پاش گیتوں کی گنگناتی مچلتی پریاں

روش روش پہ بکھیر کر دل فروز تانوں کے پھُول غنچے

بہکتی سانسوں میں مستیوں کا تلاطمِ بے کنارے کر

لرزتے ہاتھوں میں صبحِ نو کی حسین شعاعوں کے ہار لے کر

تمہاری رہ دیکھتی ہیں اپنی نظر نظر میں عقیدتوں کے دیے جلائے

ہر ایک جنبش ہر ایک دھڑکن تمہاری آمد کی منتظر ہے۔

کنول سی آنکھیں پکارتی ہیں کہ نسل و رنگت کی حد سے نکلو

قدم بڑھاؤ کثیف اندھیرے کی زد سے نکلو۔

کثیف اندھیرا کہ جس سے تنہائیاں الجھ کر سکوتِ دوراں پہ رو رہی ہیں۔

تمہارے بھوکے نڈھال جسموں کو ذلتوں میں سمو رہی ہیں۔

اگر کہیں تم نکل گئے "میں" اور "تو" کے دیرینہ بندھنوں سے

لپک کے چھو لو

وہ جھلملاتے اچھوتے لمحے

تو میرے گیتوں کی گنگناتی۔ مچلتی پریوں کی جگمگاتی کنول سی آنکھیں

چھلک چھلک کر

تمہارے ہونٹوں کے آبگینوں میں گھول دیں گی ،

نشاط انگیز نغمگی کی گلابیوں کو

اور ایک عشرتِ نواز لے میں

تمہاری سنسان زندگی کی خموشیاں گنگنا اُٹھیں گی۔

چمک اُٹھیں گی بجھی نگاہیں۔ اداسیاں مُسکرا اٹھیں گی۔

امن

اور اندھیرے کے سمندر سے اُٹھا تھا طوفاں
اپنی ہر لہر میں اسبابِ تباہی لے کر
میری فطرت کے اُجالوں کو نگلنے کے لئے
جبر و بیداد کی مکروہ سیاہی لے کر
اور میں منہ زور تھپیڑوں میں رہا تھا غلطاں
اپنے ادراک کی تاریک نگاہی لے کر

پھر اندھیرے کے سمندر سے اُٹھا ہے طوفاں

میرے اخلاص کی مستی کو ڈبونے کے لئے

نوچ کر میرے ارادوں کے درخشندہ کنول

میری راہوں میں سنئے دسوسے بونے کے لئے

حسبِ دستور مرے جھلسے ہوئے سینے میں

زہر میں ڈوبے ہوئے تیر چبھونے کے لئے

کون سمجھائے اندھیرے کے سمندر کو مگر

اَب میں اس ظلم و تشدّد کو نہیں سہہ سکتا

اَب مرا جسم ہے فولاد کا سنگیں پیکر

اب میں ان رینگتی لہروں میں نہیں بہہ سکتا

جو مری رُوح کو ڈستے رہے ناگوں کی طرح

اَب میں ان تیرہ دھندلکوں میں نہیں رہ سکتا

اَب مری منزلِ مقصود دھندلکوں میں نہیں

اب مرا ذہن منوّر ہے ستاروں کی طرح

اَب مری رفعت و عظمت کے سُنہری سپنے

میری ہر سوچ میں رقصاں ہیں بہاروں کی طرح

اَب مرے عزم قیامت کی تب و تاب کے ساتھ

تلملاتے ہیں نگاہوں میں شراروں کی طرح

توڑ سکتی ہے جو اِن رینگتی لہروں کا گھمنڈ

اَب وُہ تنویر مری مشعلِ ادراک میں ہے

چیر سکتی ہے جو ہر دیوِ ہلاکت کا جگر

اب وہ بھرپور جسارت دلِ بے باک میں ہے
پھوٹ سکتا ہے کسی وقت بھی کروٹ لیکر
ایک لاوا جو مری روحِ غضبناک میں ہے

میری آنکھوں میں دمکتی ہوئی کرنوں کی قسم
اب مری راہ سے اس رات کو ہٹنا ہو گا
وقت و حالات کے آثار یہی کہتے ہیں
اے سیہ فام دھندلکو! تمہیں چھٹنا ہو گا
اے اندھیرے کے سمندر کے امنڈتے طوفاں
اپنا رُخ تجھ کو بہرحال پلٹنا ہو گا

زندگی اپنا نیا حُسن نہیں کھو سکتی
ڈوب کر اُبھری ہے، اب غرق نہیں ہو سکتی

فیوچک

ترے عظیم ارادوں کا دل دہل نہ سکا
خرد کو ڈستے ہوئے پھانسیوں کے جھولوں میں
مہکتا کھلتا رہا تیری آرزو کا گلاب
سلگتے جلتے ہُوئے وقت کے بگولوں میں

بجھا سکی نہ تشدّد کی سرپھری آندھی
ترے یقین کی مشعل تری وفا کا چراغ

ا۔ چیکوسلواکیہ کا شہید ادیب جیولیس فیوچک

نظامِ آتش و خوں بھی شکست کر نہ سکا
ترے دہکتے ہوئے دل کے ولولوں کے اباغ

مہیب رات کے ٹھٹھرے ہوئے دھندلکوں میں
ترے لہو سے کھلے ہیں بغاوتوں کے کنول
ترے وجود نے توڑا ہے زندگی کا جمود
نئی حیات کی پیغامبر ہے تیری اجل

تری وفا ترے ایثار کے تصور سے
دل و دماغ کا کرتی ہیں بجلیاں سی طواف
رگوں میں جذبۂ تحقیر کھول اٹھتا ہے
یہ نظام کے سفاک وارثوں کے خلاف

تو آج بزمِ جہاں میں نہیں مگر پھر بھی

نفس نفس میں لہکتی ہے تیری یاد کی آگ

نظر نظر میں درخشاں ہیں جگنوؤں کی طرح

ترے خلوص کی تانیں ترے جہاد کے راگ

ترے وطن کی حسیں احمریں فضاؤں میں

مہک رہے ہیں گلستاں مچل رہی ہے بہار

روش روش پہ وہی صبح رقص فرما ہے

ترے ہی خون نے بخشا ہے جس کے رخ کو نکھار

تمام دہر کی آتش بدوش روحوں کا

تری حمیتِ بے باک کو ہزار سلام

خدا آفریں ترے عزم و عمل کی عظمت پر
ترے بلند ارادوں کو بار بار سلام

سنائی دیتی ہے ہر ذہن و دل میں جس کی دھمک
وہ انقلاب کسی طرح ٹل نہیں سکتا

چین

دیکھ وہ تیرے سرد افق سے
لال گلابی کرنیں پھوٹیں

دیکھ وہ تیرے جسم سے آخر
صدیوں کی زنجیریں ٹوٹیں

دیکھ وہ تیرے بدخواہوں کی
سانسیں اکھڑیں نبضیں چھوٹیں

دیکھ وُہ تیرے بچھڑے بچّے چوم رہے ہیں تیرے گام

لال سلام اے چین کی دھرتی چین کی دھرتی لال سلام

قدم قدم پر نگر نگر میں

خُون بھرے پرچم لہراتے

آشاؤں کے اندھیارے میں

خُون سے لاکھوں دیپ جلاتے

جاگ اُٹھے ہیں تیرے بچّے

جاگ اُٹھے ہیں نیند کے ماتے

جاگ اُٹھے ہیں سب نر ناری جاگ اُٹھے مزدور تمام

لال سلام اے چین کی دھرتی چین کی دھرتی لال سلام

دیکھ وہ اپنے راج دلارے

بھوکے ننگے اور سوالی

آنکھوں میں مستی کی لہریں
چہروں پر خوشیوں کی لالی
ڈگمگ ڈولے راج سنگھاسن
تھر تھر کانپے راج کا والی
ڈگر ڈگر پر جشن بپا ہے راج محل میں ہے کہرام
لال سلام اے چین کی دھرتی چین کی دھرتی لال سلام

سرمائے کا مرتا ڈھانچہ
کون سنبھالے کون بچائے
کون یہ سرخ انگارے پکڑے
کون یہ پھیلی آگ بجھائے
کون امنڈے طوفان کو روکے
کون چٹانوں سے ٹکرائے

پورب، پچھم، اُتر، دکھن

بول اُٹھیں خاموش زبانیں

کھول رہی ہیں لاوا بن کر

دُنیا بھر کی پگھلی جانیں

ہر سینے میں تیری دھڑکن ہر لب پر تیرا پیغام

لال سلام اے چین کی دھرتی چین کی دھرتی لال سلام

اپنا بل پہچان چکے ہیں اب تیرے مظلوم عوام
لال سلام اے چین کی دھرتی چین کی دھرتی لال سلام

تیرے فاقہ کش بچوں نے
کتنا بھاری کام کیا ہے
کھیل کے اپنے خون سے بازی
تیرے دل کا زخم سیا ہے
دُنیا بھر کے انسانوں کو
جینے کا پیغام دیا ہے

دُنیا بھر میں گونج رہا ہے ماؤ اور سن یات کا نام
لال سلام اے چین کی دھرتی چین کی دھرتی لال سلام

پھُوٹ کے تیرے ساز سے پھیلیں
آزادی کے گیت کی تانیں